رسائل و مسائل

مقروض کا صدقہ کرنا

ایک صاحب کو قرض ادا کرنا ہے لیکن وہ قرض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ صدقہ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ کیا انھیں پہلے قرض ادا کرنا چاہیے یا ساتھ ساتھ صدقہ بھی کر سکتے ہیں۔

حقوق العباد کی بروقت ادائیگی بہت زیادہ ضروری ہے۔ جن لوگوں کے قرض کسی کے ذمہ ہوں' ضروری ہے کہ وہ وعدے کے مطابق ادا کیے جائیں۔ اگر کوئی قرض ایسا ہے کہ اس کی ادائیگی کا وقت آپہنچا ہے اور صدقہ کرنے سے وہ حق متاثر ہوتا ہے تو ایسی صورت میں صدقہ کو موخر کرنا چاہیے۔ لیکن اگر قرض کی میعاد ابھی دور ہے اور غالب گمان ہو کہ صدقہ کرنے سے قرض کی ادائیگی متاثر نہ ہوگی بلکہ قرض کی ادائیگی اپنے وقت پر ہو جائے گی تو ایسی صورت میں صدقہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اتنی مقدار میں کہ گھر کے جاری اخراجات میں بھی خلل نہ آئے' ان کے لیے کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرنا پڑے اور قرض بھی اپنے وقت پر ادا ہو جائے۔ قرآن پاک میں اس کے لیے یہ اصول بیان کیا گیا ہے: "وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوماً مَّحْسُوراً (بنی اسرائیل ۱۷:۲۹) اپنے ہاتھ کو گردن سے ملا کر جکڑ نہ دو اور اسے پوری طرح کھلا بھی نہ چھوڑو کہ اس کے بعد ملامت زدہ اور حسرت زدہ ہو کر بیٹھ جائے۔ اس لیے جس طرح قرض کی وجہ سے آدمی اپنا کھانا پینا اور دیگر اخراجات محدود کرتا ہے تاکہ قرض کی ادائیگی کے لیے رقم بچائی جا سکے' اسی طرح صدقہ و خیرات کو بھی محدود کرنا چاہیے۔ اس کو بھی اس حد تک رکھنا چاہیے کہ قرضوں کی ادائیگی متاثر نہ ہو۔ (مولانا عبد المالک)

بیٹی یا بیٹے کا مسئلہ

میری شادی ایک پڑھے لکھے' بظاہر دینی مزاج رکھنے والے شخص سے ہوئی ہے۔ آج کل میں امید سے ہوں۔ شوہر مجھے اس میں tension دیتے رہتے ہیں' ان کو بیٹے کا بہت کمپلیکس ہے۔ شاید اس لیے کہ ان کے دیگر بھائیوں کے یہاں بھی کوئی اولاد نرینہ نہیں ہے۔ وہ بیٹیوں کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ ان کو یہ خیال ہے کہ ان کے یہاں بھی شاید بیٹی ہی ہو جائے اس لیے وہ مجھے سب کے سامنے نظر انداز کرتے ہیں' میری بالکل پرواہ نہیں کرتے۔ بس ہر وقت یہی کہتے رہتے ہیں کہ بیٹا ہونا چاہیے۔ انھوں نے اپنی باتوں سے مجھے یہ تاثر دیا ہے

کہ اگر بیٹی ہوئی تو وہ مجھے اور اپنی بیٹی دونوں کو پھینک دیں گے۔ پلیز آپ مجھے بتایئے کیا ایک پڑھے لکھے اور اسلام سے قریب شخص کو یہ باتیں زیب دیتی ہیں۔

اولاد کے حوالے سے بہت سے پاکستانی گھرانوں میں یہ صورت حال ہے کہ اگر کسی کے ہاں لڑکا پیدا ہو جائے تو اس کی والدہ کی قدر میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اگر لڑکی پیدا ہو جائے تو ماں کی قدر گر جاتی ہے۔ دوران حمل بھی ایک حاملہ کو بارہا اس طرح کے خیالات سننے پڑتے ہیں کہ اس کے ہاں لڑکی ہوئی تو خاندان کو بہت کم خوشی بلکہ رنج ہو گا اور اگر لڑکا ہوا تو ہر فرد خوش ہو جائے گا۔ اس بات پر حیرت اور صدمہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے خیالات بعض پڑھے لکھے بلکہ تحریک کے افراد میں بھی پائے جاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ نے لڑکیوں کی پیدائش کو ان کے والدین کے لیے نجات کا ذریعہ قرار دیا ہے نہ کہ غم و افسوس کا۔

احادیث میں ہمارے ہاں کے مروجہ غلط تصور کی شدت سے تردید کی گئی ہے کہ لڑکے لڑکیوں سے افضل ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کی پیدائش کو حقیر جاننے پر وعید کی گئی ہے۔ دراصل ہمارے بہت سے معاشرتی تصورات اسلام سے پہلے کے ہندوانہ معاشرے اور زراعتی ثقافت پر مبنی ہیں جس میں لڑکی کے مقابلہ میں لڑکے کو اثاثہ سمجھا جاتا ہے۔ حقیقت واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہمارے دیہاتی علاقوں میں جہاں کاشتکاری بنیادی ذریعہ معاش ہے، خواتین مردوں کے دوش بدوش کام کرتی ہیں اور گو کمیت و کیفیت کے لحاظ سے ان کی کارکردگی میں کوئی بڑا فرق نہیں ہوتا، اعزاز و اکرام کا حق دار مرد ہی کو قرار دیا جاتا ہے۔ ان گہرے ثقافتی معتقدات کو ٹھنڈے دل کے ساتھ تنقیدی نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے اور تحریکی افراد کو تو خالصتاً قرآن و حدیث کی بنیاد پر اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ کیا وہ اپنے دل و دماغ کو جاہلی رسومات سے آزاد کر سکے ہیں یا وہ بھی ان جاہلی تصورات کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں جن کو نبی کریمؐ نے اپنے پاؤں تلے روندا تھا۔

داعی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام جاہلی تصورات کے خلاف عملاً جہاد فرما کر ہمیں جس طرز عمل کی تعلیم دی ہے اس میں بیوی کے ساتھ حسن سلوک، محبت اور احترام بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک شخص کے اچھے اور برے ہونے کے لیے جو معیار بنایا گیا ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ کتنا اچھا ہے۔ محض اس بنا پر اپنی بیوی کو کم تر سمجھنا کہ وہ ایک یا زائد بیٹیوں کی ماں ہے، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کو رد کرتے ہوئے اپنے نفس کو اپنا رہنما بنانا ہے۔

ایک لمحے کے لیے اس مسئلے کے طبی پہلو پر بھی نظر ڈال لیجیے۔ ہماری طبی معلومات کی حد تک اگر رحم مادر میں تخلیقی مادہ کے امتزاج کے نتیجہ میں (X) کروموسوم بنیاد بنتا ہے تو لڑکی کی ولادت ہوتی ہے اور اگر (Y) کروموسوم بنتا ہے تو لڑکے کی ولادت ہوتی ہے اور اس خلیے کی ترکیب میں، ہونے والی ماں کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس پر نہ اس کا اختیار ہے نہ شوہر نامدار کا۔ اگر ذمہ داری ہے تو دونوں کی اور اگر نہیں ہے

تو دونوں میں سے کوئی بھی ذمہ دار نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے کردہ ایک تناسب ہے۔ انسانی کوشش اور سائنسی تحقیق کے دعوے کے باوجود قرآن و حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ جس جان کو جس شکل میں دنیا میں آنا ہے اس کا فیصلہ نہ والدین کرتے ہیں نہ طبی مشیر، بلکہ صرف اور صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ یہ فیصلہ فرماتے ہیں۔

کسی شوہر کا اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتراض کرنا نہ عقلی طور پر اور نہ اسلامی طور پر قابل قبول ہے۔ اس لیے جو حضرات اپنے گھر میں لڑکیوں کی پیدائش پر برہم اور مغموم ہوتے ہیں، انھیں فوری طور پر اپنے ایمان کا جائزہ لے کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے جس برکت اور فضل کا فیصلہ کیا گیا ہو اس پر نہ صرف قناعت بلکہ خوشی کا اظہار ایک دینی تقاضے اور مطالبے کے طور پر کرنا چاہیے۔

دراصل ہم ابھی جاہلی مرد آمیز (Male Chauvanist) ثقافت میں گرفتار ہیں۔ لڑکوں کی پیدائش پر پٹاخے پھٹتے ہیں، خوشیاں منتی ہیں، مٹھائی بٹتی ہے، باچھیں کھلتی ہیں اور لڑکیوں کی پیدائش پر خوشی پر اوس پڑ جاتی ہے۔ کیا یہی سید الانبیاءؐ سے محبت، اطاعت اور قربت کی علامت ہے؟ کیا یہی وہ عقلی رویہ ہے جو اسلام اپنے ماننے والوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جو لوگ اس دور میں اسلام کی دعوت لے کر اٹھے ہیں، انھیں تو اپنے گھروں میں بہترین نمونہ پیش کرنا چاہیے۔ ان کے رویوں کو جاہلی تصورات سے بالکل آزاد اور اسلام کی حقیقی تعلیمات کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ جو اپنے گھر میں، اپنی رفیقہ حیات کو بیٹی پیدا ہونے پر مجرم قرار دے سکتا ہے، وہ کس منہ سے کسی کے سامنے اللہ کے دین کی دعوت پیش کرتا ہے اور کس منہ سے اللہ کے سامنے جائے گا۔ اسے اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے اور اپنی اصلاح کرنا اور اللہ سے استغفار کرنا چاہیے۔

(ڈاکٹر انیس احمد)

گناہ گار مومن اور "نیکوکار" کافر کا فرق

> میری ایک مسیحی شاگرد کہتی ہے کہ میں نے میٹرک میں اسلامیات کے کورس میں ایک حدیث پڑھی تھی جس میں کہا گیا ہے کہ مسلمان چاہے کتنا ہی بڑا گنہگار ہو وہ کچھ عرصہ دوزخ میں اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر آخرکار ضرور جنت میں چلا جائے گا۔ مگر کافر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہیں گے۔ پھر وہ کہنے لگی آپ ہمیں بھی کافر ہی سمجھتے ہیں۔ کوئی عیسائی خواہ وہ کتنا ہی نیکوکار ہو مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق دوزخ ہی میں جائے گا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

آپ اپنی شاگرد کو پہلے یہ بات سمجھائیں کہ گناہ گار مومن اور نیکوکار کافر کے درمیان فرق کی بنیاد کیا ہے۔ مومن اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری قبول کر کے اس کے وفادار بندوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اپنی اخلاقی کمزوریوں کی وجہ سے وہ کسی جرم یا بعض جرائم کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ اس کے برعکس کافر

دراصل ایک باغی ہوتا ہے اور آپ کے کہنے کے مطابق اگر وہ نیکوکار ہو بھی تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس نے بغاوت کے جرم پر کسی اور جرم کا اضافہ نہیں کیا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو شخص باغی ہے اور صرف مجرم ہے اسے صرف جرم کی حد تک سزا دی جائے گی، بغاوت کی سزا اس کو نہیں دی جا سکتی، کیونکہ جرم کرنے کی وجہ سے کوئی شخص وفادار رعیت کے زمرے سے خارج نہیں ہو جاتا۔ لیکن بغاوت بجائے خود سب سے بڑا جرم ہے، اس کے ساتھ اگر کوئی شخص دوسرے جرائم کا اضافہ بھی کرتا ہو تو اسے وہ حیثیت کسی طرح نہیں دی جا سکتی جو وفادار رعیت کو دی جاتی ہے۔ وہ بغاوت کی سزا بہرحال پا کر رہے گا خواہ وہ اس کے علاوہ کسی جرم کا ارتکاب نہ کرے۔ لیکن اگر وہ باغی ہونے کے ساتھ کچھ جرائم کا مرتکب بھی ہو تو اسے بغاوت کی سزا کے ساتھ ان دوسرے جرائم کی سزا بھی دی جائے گی۔

اس اصولی بات کو جب وہ سمجھ لیں تو ان کو بتایئے کہ اللہ تعالیٰ کی وفادار و فرمانبردار رعیت میں صرف وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید کو کسی قسم کے شرک کی آمیزش کے بغیر اور اللہ کے سب پیغمبروں کو کسی استثنا کے بغیر، اور اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں کو کسی کا انکار کیے بغیر مانتے ہوں اور آخرت کی جواب دہی کو بھی تسلیم کرتے ہوں۔ ان میں سے جس چیز کو بھی آدمی نہ مانے گا وہ باغی ہو گا اور اسے خدا کی وفادار رعیت میں شمار نہ کیا جا سکے گا۔ اب مثال کے طور پر رسولوں اور کتابوں ہی کے معاملے کو لے لیجیے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی انجیل کو جب یہودیوں نے نہ مانا تو وہ سب باغی ہو گئے، اگرچہ حضرت عیسیٰؑ سے پہلے کے انبیا اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کو وہ مانتے تھے۔ اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے تک حضرت عیسیٰؑ کے پیرو اللہ کی وفادار رعیت تھے لیکن جب انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کو ماننے سے انکار کر دیا تو وہ بھی باغی ہو گئے۔ مسیحؑ اور انجیل اور سابق انبیا اور ان کی کتابوں کو ماننے کے باوجود وہ اللہ کی وفادار رعیت میں شمار نہیں ہو سکتے۔

یہ بات بھی جب وہ سمجھ لیں تو انھیں بتایئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جنت باغیوں کے لیے نہیں بنائی ہے بلکہ اپنی وفادار و فرمانبردار رعیت کے لیے بنائی ہے۔ اس وفادار رعیت میں سے اگر کوئی شخص کوئی ناقابل معافی جرم کرتا ہے یا اس نوعیت کے بہت سے جرائم کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اسے اس کے جرائم کے مطابق سزا دی جائے گی اور جب وہ اپنی سزا بھگت لے گا تو جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ لیکن جس نے بغاوت کا ارتکاب کیا ہے وہ کسی طرح جنت میں نہیں جا سکتا۔ اس کا مقام بہرحال دوزخ ہے۔ دوسرے کسی جرم کا وہ مرتکب نہ بھی ہو تو بغاوت بجائے خود اتنا بڑا جرم ہے جس کے ساتھ کوئی نیکی بھی اسے جنت میں نہیں پہنچا سکتی۔ (سید ابوالاعلیٰ مودودی، ترجمان القرآن، اگست ۱۹۷۵)

دعا کے لیے وسیلہ

اگر اپنی دعا کی قبولیت کے لیے وفات یافتہ بزرگوں سے وسیلہ لینا قرآن و سنت سے ثابت ہوتا تو حضرت عمرؓ دعاے استسقا میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ کو وسیلہ نہ بناتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زندگی میں ہر ایک کو عمل کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ مرنے کے ساتھ ہی یہ موقع ختم ہو جاتا ہے۔ نہ کسی کے لیے دعا کر سکتا ہے اور نہ بددعا۔ دوسرے، کسی کی حرمت و تقدس کے وسیلے سے دعا مانگنے سے خواہ مخواہ اللہ تعالیٰ کے فیاض حقیقی ہونے کے بارے میں بدگمانی کا امکان پیدا ہوتا ہے کہ وہ ازخود اور براہ راست عطا و بخشش نہیں کرتا۔ البتہ اگر اس کو کسی مقدس ہستی کا وسیلہ یا اس کی حرمت کا واسطہ دیا جائے تو پھر وہ اپنی رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے۔

آپ وسیلہ بنانے کے یہ معنی لے رہے ہیں کہ جس کو وسیلہ بنایا جا رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں کوئی سفارش کرتا ہے، اس سے دعا کرتا ہے، یا اس کے فیصلے پر اثرانداز ہوتا ہے۔ اگر کسی کے ذہن میں ایسا عقیدہ ہے، تو وسیلہ بنانا یقیناً صحیح نہیں۔ لیکن اگر ایسا کوئی عقیدہ نہیں، تو میرے نزدیک حضورؐ کا یا کسی اور کا واسطہ دینے میں کوئی غلطی نہیں۔

پھر آپ کا اعتراض یہ ہے کہ وسیلہ بنانے سے اللہ کے فیاض حقیقی ہونے کے بارے میں بدگمانی لازم آتی ہے کہ وہ ازخود عطا نہیں کرتا بلکہ مروت کا واسطہ دیا جائے تو اس کا دروازہ کھلتا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو وہی ہے جو اوپر عرض کی ہے۔ اگر کسی کا یہ عقیدہ ہے تو صحیح نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ بات لازم آتی ہے، تو پھر مردہ کا واسطہ دیا جائے یا زندہ کا، انسان کا دیا جائے یا اپنے نیک عمل کا، یا خود اپنے حق کا، دعا کے لیے کوئی مخصوص وقت یا جگہ کا انتخاب کیا جائے، یا کسی نیک آدمی سے دعا کرائی جائے، سب پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے۔ نیک عمل کا واسطہ دینا، اس حدیث سے ثابت ہے جس میں تین افراد کے، جو غار میں بند ہو گئے تھے، دعا مانگنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ آخر کیا ضرورت تھی کہ اللہ کی رحمت کو متوجہ کرنے کے لیے اعمال کا واسطہ دیا جائے، کیا وہ ازخود متوجہ نہیں ہو سکتی تھی؟ اور یہ اعمال تو اس کے علم میں تھے ہی۔ اسی طرح حضرت عباسؓ کے واسطے سے استسقا پر بھی یہی اعتراض وارد ہو گا۔

حضرت عباسؓ کا واسطہ دینے سے یہ استدلال کرنا کہ وفات یافتہ بزرگ کا واسطہ نہیں دیا جا سکتا، صحیح نہیں۔ ایک کام کو ایک طرح کرنے سے، اور ہر طرح کرنا ازخود ممنوع نہیں ہو جاتا۔ مسنون دعاؤں میں "بحق" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور اسی طرح کا لفظ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے استعمال کیا ہے۔

یہ بھی غور فرمائیں کہ آج جب کہ ایمان و اسلام معرض خطر میں ہیں، ان جزئی اختلافی مسائل میں اپنا وقت صرف کرنا کہاں تک مناسب ہے۔ (خرم مراد، ۹۶)